آہ! قاضی ایوب

مرکزی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے شیخ الحدیث مولانا قاضی محمد ایوب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ۲۲ مئی ۲۰۰۵ء کو صبح ساڑھے آٹھ بجے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انکی وفات پر مجلس التفسیر (کراچی) سراپا سوگوار ہے۔

مرحوم سے ۱۹۹۵ء میں اسلام آباد میں منعقدہ ایک سہ روزہ فقہی سیمینار میں، راقم کی متعدد بار ملاقاتیں ہوئیں۔ مرحوم کو علم وفضل کا پیکر، سادگی وشرافت کا مرقع، حسن صورت کا حامل اور حسن سیرت کا نمونہ پایا۔ سیمینار کے موقع پر میرے روم میٹ پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن تھے۔ چنانچہ قاضی صاحب مرحوم کبھی ہمارے کمرے کی طرف اور کبھی ہم انکے کمرے کی طرف چلے جاتے اور مختلف موضوعات زیر بحث رہتے۔ متعدد بار ہم نے قاضی صاحب مرحوم کی اقتداء میں نمازیں پڑھیں اور سیمینار کے وقفوں میں کئی بار اکٹھے گھومنے گئے۔ قاضی صاحب کے ساتھ متعدد تصویریں بھی بنوائیں۔ تصویروں کا کیا؟ وہ تو ظاہر کا ایک پردہ ہیں اصل بات تو یہ ہے کہ وہ اپنی متعدد یادوں کے ساتھ راقم کے دل میں جلوہ افروز ہیں۔

مرحوم کے تبحر علمی کا اندازہ، اس وقت ہوا جب مفتی منیب الرحمٰن، مولانا صدیق ہزاروی اور راقم کے سامنے مرحوم نے سیمینار میں پیش کئے گئے ایک عربی مقالہ پر فی البدیہہ تنقید کرنی شروع کی اور اس ضمن میں مقالہ پر متعدد اشکالات پیش کر کے علمی وتحقیقی مباحث چھیڑ دیئے۔ اس وقت مرحوم پر کسی "استادِ کامل" کا گمان ہو رہا تھا۔ ان کی طرف سے اٹھائے گئے نکات پر مولانا ہزاروی اور مفتی منیب الرحمٰن بھی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔

قاضی صاحب مرحوم نے اس سیمینار کے موقع پر راقم کو اپنی خصوصی توجہات اور شفقتوں سے نوازا۔ انکی حکیمانہ نصیحتوں نے دل پر انمٹ نقوش قائم کئے۔ وہ روحانی اقدار میں اپنے اسلاف کے نمائندہ تھے چند اور مختصری ملاقاتوں کے بعد ان کے بارے میں راقم کا تاثر یہ ہے کہ وہ انتہائی سادہ اور منکسر المزاج عالم دین تھے نیز روحانی قدروں کے امین بھی۔ انکی موت نے راقم کو ذہنی صدمہ سے دوچار کیا ہے۔ اب دل میں انکی یاد ہے اور زبان پر دعائے مغفرت۔ خدا انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے (آمین)۔

فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر

(مدیر اعلیٰ)

مرکزی
پبلک لائبریری
نمبر ۲۱۸۱
پبلک لائبریری

مسلم وغیر مسلم افراد اور حکومتوں کے مابین تعلقات

ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج
استاذ الفقہ و التفسیر،
شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

مسلمانوں کو اپنے قومی ودینی معاملات میں کسی ایک مرکز پر جمع ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ وہ معاملات ہیں جو مسلمانوں کے ذاتی معاملات پر مقدم کر دیئے گئے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ النور میں ہے۔ انما المومنون الذین امنوبا للہ ورسولہ و اذا کانو امعہ علیٰ امر جامع لم یذھبو ا حتیٰ یستاذنوہ ۔۔ الخ ۱؎ حقیقی مومن وہی ہیں، جو اللہ اور اسکے رسول پر ایمان لاتے ہیں اور جب کسی اجتماعی مسئلہ میں اس (رسول) کے ساتھ جمع ہوتے ہیں تو (اس معاملہ کو ادھورا چھوڑ کر) جاتے نہیں۔ جب تک اس (رسول) سے اجازت نہ لے لیں۔ (یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ فی الواقعہ خدا اور رسول پر ایمان رکھتے ہیں)۔

امام راغب اصفہانی نے لکھا ہے۔ امر لہ خطر یجتمع لا جلہ الناس فکان الامر نفسہ جمعھم ۲؎ امر جامع وہ امر ہے، جو بذات خود اتنا اہم اور فوری توجہ کا متقاضی ہے کہ لوگ اس کے لئے اکٹھے ہو جائیں گویا وہ امر فی نفسہ لوگوں کو جمع کرنے کا باعث ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قومی یا دینی معاملات ذاتی معاملات پر ترجیح رکھتے ہیں چنانچہ ضروری ٹھہرا کہ جب کسی ایسے ہی مسئلہ کے لئے بلایا جائے تو نہ صرف یہ کہ بروقت حاضر ہوں۔ بلکہ وہاں سے اس وقت تک نہ جائیں۔ جب تک رسول (داعی) سے اجازت نہ لے لیں۔

ضمناً عرض ہے کہ آج مسلمانوں کے معاشروں کی مجالس قومی اور محافل دینی کی یہ حالت ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ اول تو وہاں لوگ جاتے نہیں۔ اور جو جاتے ہیں تو محض رسمی کارروائی نبھانے، گویا بالکل آخر میں۔ وقت کی پابندی سے خود کو مستثنیٰ سمجھتے ہوئے۔ اور یہ استثناء جو بعض حالات میں بعض لوگوں کے لیے ہوسکتا ہے۔ اب پوری کی پوری قوم اسی استثنیٰ پر عمل پیرا ہے۔ اور وہ چار ہی ہیں۔ جو وقت کی پابندی کا خیال رکھتے ہیں۔

مجلس شوریٰ کا تصور:

قومی یا دینی معاملات میں بلاوا چونکہ مشورہ کے لیے ہوتا ہے۔ اور کوئی بھی اہم کام بغیر مشورے کے کرنا غیر دانشمندانہ اقدام ہے۔ اس لیے مشاورت، مسلمانوں کی اہم خصوصیت اور ضرورت قرار دی گئی ہے۔ جیسا کہ شوریٰ میں ہے۔ والذین استجابو الربھم واقامو الصلوٰۃ و امر ھم شوریٰ بینھم و مما رزقنھم ینفقون ؎ اور جو لوگ اپنے پروردگار کی فرمانبرداری کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور اپنے اہم معاملات میں ایک دوسرے سے مشورہ کرتے ہیں اور اس سے جو ہم نے انہیں دیا خرچ کرتے ہیں۔

مشورہ چونکہ قومی کاموں میں زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ اور قومی امور زیادہ تر حکومتوں کے تعلق سے قائم ہوتے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو تعلیم دی گئی ہے کہ ان کی حکومتوں کی بنیاد مشورہ پر ہونی چاہیے۔ اور پارلیمان چونکہ قانون ساز ادارہ ہوتا ہے اس لیے اس کی اہمیت سے بلکہ ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ درحقیقت مجلس شوریٰ کے قیام کا تصور سوائے قرآن کے کسی مذہب کی کتاب میں نہیں پایا جاتا۔ شوریٰ کے حوالے سے جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال اپنے ایک مقالہ میں رقم طراز ہیں:

> اس آیت میں جو لفظ شوریٰ آیا ہے۔ اس سے یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس شوریٰ سے مراد مجلس مشاورت (Advisory Board) ہے یا مجلس شوریٰ (Consultative Body) ہے۔ تو پھر اس میں مسئلہ آجائے گا اس امارت کا جو مطلق العنان ہوسکتی ہے اور درحقیقت ہوتی رہی ہے کیوں کہ خلیفہ مجلس مشاورت (Advisory Board) کے مشورے کا پابند نہیں ہوگا۔ لیکن اگر یہ مجلس شوریٰ یعنی (Consultative Body) ہے تو وہ اسمبلی کی طرح ہے جس کو آپ منتخب کرتے ہیں قانون سازی کا کام کرنے کے لئے اقبال اس کو جدید شکل کا اجماع کہتے ہیں۔ اس لیے کہ جب آپ اپنے

نمائندوں کا انتخاب کرکے ان کو حق قانون سازی دیں گے تو ان کی قانون سازی ایک طرح سے اجماع امت ہوگا۔ لیکن یہ ایک ایسی بات ہے جس پر ہمیشہ علماء کو اعتراض رہا ہے۔ آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اقبال کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ اجتہاد کا اختیار انفرادی مجتہدین کے ہاتھ سے لے کر مسلم اسمبلی کو دینا چاہتے ہیں۔ جو درحقیقت بہت بڑا انقلاب ہے جسے میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے قدامت پسند علماء قبول کرنے کو تیار نہیں ؎

نیز لکھتے ہیں:

۔۔۔ قانون سازی کے کام کے سلسلے میں اقبال کے فلسفے کی بنیاد ان کے ثبات فی التغیر (Permanance In Change) کے تصور پر ہے۔ یعنی ثبات صرف تغیر کو حاصل ہے۔ اس کی تشریح وہ اس طرح کرتے ہیں کہ جہاں تک عبادات کا معاملہ ہے اس میں تو ثبات کا اصول کارفرما ہے۔ عبادات میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن جہاں تک عبادات کا معاملہ ہے اس میں تو ثبات کا اصول کارفرما ہے۔ عبادات میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن جہاں تک معاملات کا تعلق ہے۔ وہ تغیر کے اصول کے پابند ہیں یعنی تمام معاملات اقبال کے نزدیک تغیر کے اصول کے پابند ہیں۔ اسلام میں اگر کوئی چیز تغیر سے باہر ہے تو وہ صرف اور صرف عبادات ہیں۔ ان میں کوئی تغیر و تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ نماز کے اوقات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ روزے کے اوقات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی لیکن معاملات کو وقت کے تقاضوں یا قوم کی بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق تبدیل کیا جاسکتا ہے اس کا حق اقبال اس اسمبلی کو دیتے ہیں، جسے وہ اجماع کہتے ہیں اور اجماع اقبال کے نزدیک مجلس شوریٰ یا پارلیمنٹ ہے۔ لیکن اس مجلس شوریٰ کا کام کسی حاکم یا امیر کو مشورہ دینا نہیں بلکہ خود حاکمیت کے فرائض انجام دینا ہے۔ یہ مجلس شوریٰ تین اہم میدانوں میں قانون سازی کے فرائض انجام دے سکتی ہے۔ اور وہ تین اہم میدان یہ ہیں:

۱۔ رائج الوقت قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق ڈھالنا

۲۔ ایسے اسلامی قوانین نافذ کرنا، جو اب تک نافذ نہیں کیے گئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۔ایسی قانون سازی کرنا جو قرآن وسنت سے متصادم نہ ہو۔[۵]

ضرورت مشاورت کی اہمیت اس آیت سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ فاعف عنہم واستغفر لہم وشاورھم فی الامر۔[۶] (اے رسول ﷺ) آپ ان کی کوتاہیوں کو معاف کر دیجئے اور انکے لیے (اپنے پروردگار سے) حفاظت کا سامان طلب کیجئے۔اور (اہم قومی) معاملات میں ان سے مشورہ کیجئے۔

اسی سورہ کی ۱۵۵ ویں آیت یہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی طرف سے معافی دے دی تھی۔مگر چونکہ ان سے حکم رسول ﷺ کی نافرمانی ہوئی تھی اس لیے اب آپ کو بھی معاف کرنے کا حکم ہوا۔ اور ساتھ ہی ساتھ شوریٰ میں بھی شریک کرنے کا حکم ہوا شوریٰ کا حکم تو قرآن میں پہلے سے موجود تھا۔ یہاں اس کے ذکر میں یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ ایک دفعہ کی نافرمانی سے مشورہ کی اہلیت زائل نہیں ہوتی۔ حالانکہ یہ نافرمانی فقط سیاسی نوعیت کی نہ تھی بلکہ عین حالت جنگ میں جنگی نوعیت کی تھی۔آج کی مہذب دنیا میں اس طرح کے نافرمانوں کو کورٹ مارشل کی سزا دی جاتی ہے مگر قرآن اپنی تعلیمات میں نام نہاد مہذب قوموں سے بہت آگے ہے۔

یہاں مشاورت کے حکم کو پیش کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جنگ احد میں جو مصیبت پیش آئی تھی وہ شوریٰ کے فیصلہ پر عملدر آمد سے ہی پیش آئی تھی۔اس حکم کو دہرا کر یہ بتادیا کہ گو نتیجہ شوریٰ کا غلط نکلا ہے۔مگر مشاورت کے اصول کو پھر بھی قائم رکھنا ہے۔کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک بار کی غلطی سے اس اہم اور عظیم اصول کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔چنانچہ مسلمانوں کی حکومت اس مشاورت کے اصول پر قائم کی گئی۔اس اصول کو حکومت اسلامی کے قیام، بقا اور استحکام کی اساس قرار دیا جاتا ہے۔

مسلم قومیت:

مسلم معاشرہ رنگ ونسل، زبان یا علاقہ کے اشتراک کے بجائے اشتراک ایمان پر قائم ہوتا ہے۔مسلم معاشرہ اسی طرح وجود میں لایا جاسکتا ہے کہ اس کی قومیت کا تعین کیا جائے اور وہ قومیت ہے اشتراک ایمانی نہ کہ اشتراک وطنی ونسلی ولسانی۔بلاشبہ مسلم معاشرے کے قیام کے لیے مسلم ریاست نا گزیر ہے۔مگر یہ بھی قومیت کی بنیاد نہیں بن سکتی۔البتہ اسے اسلام کے علاقائی تشخص سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ ایک ایسی ریاست جہاں مسلمانوں میں تو اشتراک ایمانی ہو اور غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ اشتراک وطنی کی بنیاد پر رشتہ استوار ہو۔چنانچہ ان دونوں اشتراکات کی بنیاد پر دنیا کے تمام انسانوں

کے درمیان اتحاد انسانیت قائم ہو سکتا ہے۔

اتحاد انسانیت:

اتحاد انسانیت کے عالمگیر نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ غیر مسلموں سے بھی محبت و ہمدردی کی جائے۔ان کے جان ومال وآبرو کی حفاظت کی جائے۔ان کی عبادت گاہوں کا تحفظ کیا جائے۔

اسلام میں قصاص کا حکم بھی دراصل مساوات نسل انسانی کا بہت بڑا ثبوت ہے۔حکم قصاص میں تمام امتیازات کو اٹھا دیا گیا ہے۔سورۂ بقرہ میں ہے۔[۸] اگر آزاد شخص نے قتل کر دیا ہے تو جواب میں اسی آزاد کو قتل کیا جائے اگر قتل کسی عورت نے کر دیا ہے تو جواباً اسی عورت کو قتل کیا جائے گا اور اگر قاتل غلام شخص ہے تو قصاص میں اسی غلام کو مارا جائے گا۔غرض کہ یہاں سارے امتیازات قومی ووطنی، نسلی ولسانی کو اٹھا دیا گیا ہے۔

سورۂ حج میں ہے۔[۹] اگر اللہ نے طاقت ور حملہ آوروں کے تدارک کے لئے مسلمانوں کو کھڑا نہ کیا ہوتا تو عیسائیوں کے گرجے یہودیوں کے عبادت خانے، گوشہ نشینوں کی خانقاہیں اور مسلمانوں کی مسجدیں کہ جہاں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے سب منہدم ہو جاتے۔یہاں اسلامی جنگ کی غرض صرف مسجدوں کو بچانا نہیں بلکہ ہر مذہب کی عبادت گاہ کو بچانا بتائی گئی ہے۔یہاں تک کہ نجی طور پر بنائے گئے عبادت خانے بھی اس میں شامل کر دیے گئے ہیں۔صحابہ کے زمانے کی جنگوں میں بھی معبدوں کے تقدس کو مدنظر رکھا جاتا تھا کہ کسی راہب کی خانقاہ اور عبادت گاہ کو نقصان نہ پہنچ جائے۔بلکہ بعض معاہدات کی رو سے کلیساؤں کی حفاظت اور ان کی تعمیراتی دیکھ بھال کا انتظام بھی اسلامی حکومت کے ذمہ تھا۔یہ فقط اسلام ہی کی خصوصیت ہے کہ اس نے نہ صرف سارے مذاہب کی اصلیت کو خدا کی طرف سے نازل کردہ مانا ہے بلکہ ان کے معبدوں کے تحفظ کو بھی مسلم ریاست کے فرائض میں داخل کر دیا ہے۔

واضح ہو کہ اس حکم میں صرف اہل کتاب ہی شامل نہیں۔کیوں کہ جب ایران فتح ہوا تو وہاں پر موجود مجوسیوں کے ماننے والوں کو اہل کتاب کی مثل قرار دیا گیا۔اور انکے ساتھ وہی معاملہ کیا گیا جو اہل کتاب کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ان کے لیے کمثل اہل کتاب کی اصطلاح وضع کی گئی۔اور ان کے جان و مال وآبرو کی حفاظت کے ساتھ ان کے عبادت خانوں کی بھی حفاظت کی گئی اور یہی صورت ہندوستان میں بھی پیش آئی۔یہاں بھی بعض فقہا نے ہندوؤں کو کمثل اہل کتاب کے زمرے میں شامل کر کے مسلم ریاست پر یہ فرض عائد کر دیا کہ وہ غیر مسلموں اور ان کی عبادت گاہوں کا تحفظ کرے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہو سکا کہ مسلمانوں کو بتایا گیا تھا کہ ان کی جنگ کسی دنیوی غرض کے لیے نہیں ہوتی۔ مگر آج مہذب دنیا تو سیع پسندانہ عزائم کے ساتھ دوسرے ملکوں اور قوموں کے وسائل اور رزق پر قبضہ کرنے کی منصوبہ بندیوں میں تیزاسے روبہ عمل لانے میں مصروف نظر آتی ہے۔ جبکہ مسلمانوں کو دفاعی جنگ کا حکم قیام امن اور مذہبی آزادی کے لئے دیا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ میں ہے۔ وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلو کم ولا تعتدوا۔۔۔الخ [۱۰] اللہ کے رستے میں ان لوگوں سے (حق دفاع استعمال کرتے ہوئے) لڑو۔ جو تم سے لڑ رہے ہیں۔ اور باوجود لڑائی کے فریق مخالف پر زیادتی نہ کرو۔

ظاہر ہے کہ اسلام اپنے دشمنوں سے جنگ کو اس شرط سے مشروط کرتا ہے کہ جب وہ تم سے آمادۂ جنگ ہوں تو جواب میں برسر پیکار ہونا اور یہ بھی تاکید کرتا ہے کہ جنگ کو اس کی حد سے آگے نہ بڑھنے دینا۔ یہ حکم بھی مذہبی آزادی اور قیام امن کے لیے نظر آتا ہے نہ کہ فتوحات ملکی یا اصلاً مال غنیمت کے حصول کے لئے۔

قرآن میں تو دشمن سے بھی عدل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ سورۂ المائدہ میں ہے۔ ولا یجرمنکم شنان قوم ان صدو کم عن المسجد الحرام ان تعتدوا [۱۱] اور تمہیں کسی قوم کی (یہ) دشمنی کہ انہوں نے تم کو مسجد حرام (یعنی خانہ کعبہ کی حاضری) سے روکا تھا۔ اس بات پر ہرگز نہ ابھارے کہ تم (ان کے ساتھ) زیادتی کرو۔ اور اس سورہ کی آٹھویں آیت میں ہے۔ ولا یجرمنکم شنان قوم علیٰ الاّ تعدلوا۔ اور کسی قوم کی سخت دشمنی (بھی) تمہیں اس بات پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم (اس سے) عدل نہ کرو۔

دشمن کے ساتھ انصاف کرنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ مگر یہاں اسی مشکل کام کا حکم دیا جا رہا ہے۔ مذہبی دنیا یا مہذب دنیا کا کوئی مذہبی و سیاسی لٹریچر، اس حکم کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ اس حکم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو دشمن نہ ہوں یا جن سے معاہدات کی بنیاد پر تعلقات اتحاد و محبت قائم ہوں۔ ان کے حقوق کی نگہداشت کس قدر ضروری ہوگی۔ اس طرح یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ جب دشمنوں کے ساتھ انصاف ہوگا تو اپنوں کے ساتھ کیا ہوگا؟

دراصل یہ بھی قرآن ہی کا طرہ امتیاز ہے کہ اس کے پاس دشمن اقوام کے مابین محبت پیدا کرنے کی بھرپور صلاحیت اور طاقت موجود ہے۔ جس قرآن نے اپنے زمانہ نزول میں باہم نفرتوں کی آگ میں جلنے والی اقوام میں شمع محبت جلا دی تھی۔ صدیوں کی خطرناک دشمن اقوام کو ملا کر ایک کر دیا تھا۔

وہ آج بھی دنیا کی سخت ترین دشمن اقوام میں باہمی محبت پیدا کر سکتا ہے۔ حالانکہ یہ وہ مشکل کام ہے۔ جو ساری دنیا کے خزانے صرف کرنے سے بھی نہیں ہو سکتا۔ مگر قرآنی تعلیمات کو اپنانے سے بظاہر ناممکن کام بہت آسانی سے ممکن ہو سکتا ہے۔ سورۂ انفال میں ہے۔ والف بین قلوبھم لو انفقت ما فی الارض جمیعا ما الفت بین قلوبھم ولکن اللہ الف بینھم [۱۲] اور اس نے ان کے دلوں میں باہمی الفت پیدا فرما دی اگر آپ وہ سب کچھ جو زمین میں ہے خرچ کر ڈالتے ہیں تو (ان مادی وسائل سے) بھی آپ ان کے دلوں میں یہ الفت پیدا نہ کر سکتے لیکن اللہ نے (قرآن کے ذریعہ) ان کے درمیان محبت پیدا فرما دی ہے۔

بات اصل میں یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو دنیا کی تمام اقوام کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوا۔ انما انت منذر و لکل قوم ھاد [۱۳] تم تو ڈر سنانے والے ہو اور ہر قوم کے ہادی۔ اور آپ ﷺ کی رسالت کل عالم کے لئے رحمت ہے جیسا کہ سورۂ انبیا میں ہے وما ارسلنک الا رحمۃ للعلمین [۱۴] ہم نے آپ کو کل عالم کے لئے سراسر رحمت کیا۔ یہ ایک عظیم الشان حقیقت ہے اس میں نہ صرف بتایا گیا ہے کہ آپ کل عالم کے لئے مبعوث ہوئے ہیں بلکہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آپ سراسر رحمت ہیں۔ اور صفت رحمت کا تقاضا ہے کہ آپ اپنے دشمنوں کو تباہ و برباد نہ کریں۔ بلکہ ان کی اصلاح کریں ایک حدیث میں آیا ہے ایک مرتبہ جب آپ سے کہا گیا کہ یا رسول اللہ! آپ مشرکوں کے لئے دعائے ضرر کیجئے۔ تو آپ نے فرمایا انی لم ابعث لعانا وانما بعثت رحمتہ میں۔ [۱۵] میں لعنت کے لئے مبعوث نہیں ہوا بلکہ رحمت کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ رسول اللہ کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ اس نے دشمنوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

انت فہم نے عدو کو بھی لیا دامن میں!
عیش جاوید مبارک تجھے شیدائی دوست [۱۶]

(احمد رضا بریلوی)

قرآن کے ماننے والوں اور اس پر عمل پیرا ہونے والوں سے دنیا کی کسی قوم کو کوئی خطرہ ڈر اور خوف محسوس نہیں کرنا چاہیے۔ اسلام کی الہامی کتاب اس امر پر کافی گواہ ہے۔ نیز مسلمانوں نے اپنے زمانہ عروج یا دور تغلب و تسلط میں بھی اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ برا سلوک کبھی نہیں کیا۔ اسلام کے پھیلاؤ اور تبلیغ میں ہمیشہ قرآن اور مسلمانوں کا پر خلوص عمل ہی کارفرما رہا ہے۔ اسلام نہ تو جبر سے پھیلا ہے اور نہ ہی جبر سے پھیل سکتا ہے۔ لا اکراہ فی الدین [۱۷] تبلیغ دین کا بنیادی اصول تھا ہے اور رہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گا۔ اسلام نے ہر مذہب کا احترام کیا ہے اور احترام کرنا سکھایا ہے۔ اس نے مخالف قوم سے بھی دوستی اور مودت کا حکم دیا ہے۔ البتہ یہ حکم من دون المومنین۔[18] کی قید سے وابستہ کیا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے غیر مسلموں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ بصورت دیگر دوست بنانے سے نہیں روکا گیا۔ اس سے بڑھ کر معاشرتی اور عمرانی تقاضوں کی صورت گری کسی اور کے ہاں ملتی ہو تو بتائی جائے۔

سورۂ ممتحنہ میں بہت جامع انداز میں مسلمانوں کے کفار کے ساتھ تعلقات پر بحث کی گئی ہے۔ اگر ایک طرف ان کفار سے جو مسلمانوں سے مصروف جنگ ہیں۔ ہر طرح پر ترک موالات کا حکم دیا گیا ہے تو دوسری طرف وہ غیر مسلم جو پر امن ہیں اور جنگ میں حصہ نہیں لیتے ان سے احسان کرنے اور انصاف برتنے کا بھی حکم موجود ہے۔

دشمن قوم سے تعلق رکھنے والی کسی عورت سے نکاح اس غرض کے لئے ہو سکتا ہے کہ اس قوم کے ساتھ اتحاد پیدا کیا جائے، تا کہ دشمنی ختم ہو سکے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اسی غرض کے لیے دو نکاح بھی فرمائے۔ ایک حضرت صفیہ کے ساتھ، جو قوم یہود سے تھیں۔ اور دوسرا حضرت جویریہ کے ساتھ جو بنی المصطلق سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس طرح ایک قبطی خاتون ماریہ کو بھی اپنی ازواج میں داخل کر کے آپ نے اپنی اعلیٰ ظرفی، بلند حوصلگی اور کشادہ دلی کا ثبوت دیا۔ اور مسلمانوں کو اس باب میں بھی اسوۂ حسنہ فراہم کیا۔ اگر قرآن میں کفار سے ترک موالات کا حکم مستقل بنیادوں پر ہوتا اور ہر قسم کے کفار پر اس کا اطلاق ہوتا تو مسلمانوں کو اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی ہرگز اجازت نہ ملتی جو جعل بینکم مودة ورحمة ۔[19] (اور تمہارے مابین اس نے محبت و ہمدردی پیدا کی) کے تحت شوہروں کی محبت و ہمدردی کا مورد و مہبط ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں غیر مسلم کتابیہ سے بغیر محبت و ہمدردی کے نکاح خود قرآن کے خلاف ہوتا۔ اس لیے ثابت ہوا کہ کفار سے ترک موالات یکساں مدارج کا حامل نہیں۔ اور لا تجد قوماً یومنون باللہ والیوم الاخر یوادون من حاد اللہ ورسولہ ولو کانوا اباءھم ۔۔۔ الخ میں حاد اللہ ورسولہ سے مراد وہ کفار ہیں جو اپنی عداوت میں تمام حدیں پار کر چکے ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حالت جنگ میں ایک قوم بحیثیت مجموعی حاد اللہ ورسولہ کا مصداق بن جاتی ہے۔ اگر چہ اس قوم کے بعض افراد بھی اس حد پر نہ بھی پہنچے ہوں۔ جس پر ان کے بعض پہنچ چکے ہوں۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس قوم کے ہر فرد سے اس کی حالت و حیثیت کے مطابق ہی معاملہ کیا جائے گا اور اسی کا نام عدل ہے، جس پر اسلام کا بہت زور ہے۔

قرآن کی یہ تعلیم بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اس نے اہل کتاب کے طعام کو ان کے لیے جائز قرار دیا ہے۔[21] اس طرح قرآن نے جب ہمسایوں کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم دیا تو اس نے مسلم اور غیر مسلم کی تمیز بھی ختم کر دی۔[22] یہاں تک کہ لین دین کے سلسلے میں بھی کوئی تمیز نہیں رکھی گئی۔ بخاری میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ فوت ہوئے تو آپ کی زرہ تیس وسق جو کے عوض ایک یہودی کے پاس رہن رکھی تھی۔ جو آپ نے اپنے گھر والوں کے گزارہ کے لیے حاصل کیے تھے۔ اس حدیث سے نبی اکرم ﷺ کے قوم یہود سے تعلق دنیاداری کا پتہ چلتا ہے۔ اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ عرب کے حکمران بھی تھے مگر آپ کے گزر بسر کی حالت، کس قدر مسکینی اور عاجزی کی تھی، آپ چاہتے تو بیت المال سے ہر قسم کی آسائش مہیا کر سکتے تھے مگر آپ نے ایسا نہیں کیا۔ کیا اس کی نظیر دنیا کے کسی قدیم یا جدید حکمران کے ہاں مل سکتی ہے؟

اسلام کی وسعت غیر مسلموں کی شہادت (گواہی) میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ وصیت کے معاملات میں جس طرح اپنوں (مسلمانوں) کی گواہی معتبر قرار دی گئی ہے۔ ویسے ہی غیروں (غیر مسلموں) کی بھی جائز رکھی گئی ہے۔[23] اور یہ جو فرمایا ہے ان انتم ضربتم فی الارض یعنی جب تم سفر کی حالت میں ہو، تو یہاں صرف ایک سخت ضرورت کی حالت کو بیان کیا گیا ہے یہ حالت بطور شرط کے نہیں ہے۔

غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک اور رواداری، نیکی اور احسان، محبت و ہمدردی، مودت و پیار کے یہ چند نمونے تھے جو مسلمانوں کی بنیادی کتاب قرآن مجید فرقان حمید میں مذکور ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان تعلیمات پر عمل کرنے والا دہشت گرد بھی ہو سکتا ہے۔

ترک موالات کی حقیقت:

اسلام پر کفار کے ساتھ ترک موالات کے مسئلہ پر سخت اعتراض کیا جاتا ہے مگر اعتراض کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ اسلام نے ترک موالات کو من دون المومنین کی قید سے مشروط کیا ہے جس کا صاف اور صریح مطلب یہ ہے کہ کفار کے ساتھ دوستی ہمدردی، اتحاد اور موالات سب جائز ہے۔ بشرطیکہ یہ کہ مسلمانوں کے مفاد کے خلاف نہ ہو مولانا امین احسن اصلاحی کے بقول "(من دون المومنین کی)" اس قید نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ غیر حربی کفار کے ساتھ اس نیکی عدل اور احسان کی ممانعت نہیں ہے جس کی اسلام نے تمام بنی نوع انسان کے معاملہ میں ہدایت فرمائی ہے مسلمان غیر مسلم قوموں اور حکومتوں کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساتھ دوستانہ سیاسی و اقتصادی معاہدے بھی کر سکتے ہیں بشرطیکہ کہ من دون المومنین نہ ہوں"۔۴۳

یہی وجہ ہے کہ حبشہ میں ہجرت کر کے جانے والے مسلمانوں نے حبشہ کے عیسائیوں کی حمایت میں ان کے دشمنوں کے خلاف جنگ میں عملاً حصہ لیا۔ نبی کریم ﷺ نے مشرک قبائل سے معاہدات کیے اور یہودیوں سے بھی معاہدات کیے۔ جن میں دشمنان اسلام کے مقابلہ میں انہوں نے غیر جانبدار رہنا منظور کیا یا مسلمانوں کی مدد کرنا اس شرط پر منظور کیا کہ ان پر حملے کے وقت مسلمان بھی ان کی مدد کریں گے۔ چنانچہ جنگ حنین میں مشرکین مسلمانوں کی فوج میں شامل تھے۔ دور صحابہ میں ایران کی جنگوں میں عیسائی حضرات، مسلمانوں کی فوج میں شامل ہو کر پہلو بہ پہلو لڑے۔

مفتی احمد یار خان نعیمی نے بھی لکھا ہے کہ:

"کفار کو اسلامی لشکروں میں بھرتی کرنا جائز ہے۔ بشرطیکہ کفار سے جنگ ہو نہ کہ باغیوں سے (روح المعانی)۔۔۔ نبی ﷺ نے یہودی قینقاع سے جنگ میں مدد لی اور انہیں مال غنیمت میں سے کچھ مال بھی عطا فرمایا۔ نیز غزوہ بنی ہوازن میں صفوان بن امیہ سے مدد لی"۔۴۵

مولانا صلاح الدین یوسف نے لکھا ہے:

"حسب ضرورت و مصلحت ان سے صلح و معاہدہ بھی ہو سکتا ہے اور تجارتی لین دین بھی، اسی طرح جو کافر مسلمانوں کے دشمن نہ ہوں ان سے حسن سلوک اور مدارات کا معاملہ بھی جائز ہے (جس کی تفصیل سورۂ ممتحنہ میں ہے) کیوں کہ یہ سارے معاملات، موالات (دوستی و محبت) سے مختلف ہیں"۔۴۶

اور پیر محمد کرم شاہ الازہری نے لکھا ہے:

"غیر مسلم حکومتوں کے ساتھ تجارت کرنا یا عام انسانی فلاح و بہبود کے کاموں میں ان کے ساتھ تعاون کرنا عالمی امن و سلامتی کی بقا کے لئے مل کر کوشش کرنا یا ایک مشترک دشمن کے مقابلے کے لیے ان کے ساتھ فوجی پیکٹ کرنا یا عام میل جول اور معاشرت میں غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک اور خندہ پیشانی سے پیش آنا قطعاً ممنوع نہیں"۔۴۷

کون نہیں جانتا کہ آنحضرت ﷺ کی مدینہ منورہ تشریف آوری پر یہود اور مسلمانوں میں ایک معاہدہ ہوا تھا جس کی رو سے دونوں فریق اس امر کے ذمہ دار تھے کہ اگر باہر سے کوئی دشمن مدینہ منورہ پر حملہ آور ہو تو اس کا دفاع دونوں فریق مل کر کریں گے۔ خلاصہ یہ کہ غیر مسلم اقوام سے سیاسی، اقتصادی، عسکری، غرض بھی اقسام کے معاہدے ہو سکتے ہیں مگر اس شرط کے ساتھ کہ ان معاہدوں کے ذریعے مسلم بھائیوں اور مسلم ملکوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے عصر حاضر کے تناظر میں یہی نکتہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل

ہے۔

حوالہ جات وحواشی

(مہر) ۲-۱۸۱ مجلہ لائبریری

۱۔ النور۔ ۶۲

۲۔ المفردات فی غریب القرآن، کتاب النجم، ص ۹۷

۳۔ الشوریٰ۔ ۳۸

۴۔ اقبال۔ فکر اسلامی کی تشکیل جدید، ص ۹۸، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، ۱۹۸۸ء

۵۔ ایضاً ص ۱۰۵۔۱۰۶

۶۔ آل عمران۔ ۱۵۹

۷۔ ولقد عفا الله عنهم ط ان الله غفور حليم

۸۔ البقرہ۔ ۱۷۸

۹۔ الحج۔ ۴۰

۱۰۔ البقرہ۔ ۱۹۰

۱۱۔ المائدہ۔ ۲

۱۲۔ الانفال۔ ۶۳

۱۳۔ الرعد۔ ۷

۱۴۔ یہ ترجمہ مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ترجمہ قرآن کنز الایمان سے لیا گیا ہے۔ اس ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ مولانا نے منذر اور ہاد کی صفات کو پیغمبر اکرم کی طرف لوٹاتے ہوئے ترجمہ کیا ہے۔ جبکہ اکثر مترجمین نے منذر کی صفت رسول اللہ کی طرف اور ہاد کی صفت ہر قوم کے پیغمبر کی طرف لوٹائی ہے۔ انگریزی زبان میں اس ترجمے کی مثال عبداللہ یوسف علی، محمد مارماڈیوک پکتھال اور آرتھر جے آربری کے ہاں بھی ملتی ہے۔ اور اردو مترجمین میں مولانا بریلوی سے قبل سرسید احمد خان کے ہاں اس کی مثال پہلے سے موجود ہے۔

۱۵۔ الانبیاء۔ ۱۰۷

۱۶۔ حدائق بخشش۔ تحقیقی وادبی جائزہ، مرتب شمس بریلوی، ص ۴۵، مدینہ پبلشنگ کمپنی، ایم۔ اے جناح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روڈ، کراچی۔

۱۷۔ البقرہ۔ ۲۵۶

۱۸۔ آل عمران۔ ۲۸

۱۹۔ الروم۔ ۲۱

۲۰۔ المجادلہ۔ ۲۲

۲۱۔ المائدہ۔ ۵

۲۲۔ النساء۔ ۳۶

۲۳۔ المائدہ۔ ۱۰۶

۲۴۔ تدبر قرآن، جلد دوم، حاشیہ زیر آیت، ۲۸، آل عمران

۲۵۔ اشرف التفاسیر المعروف بہ تفسیر نعیمی، جلد سوم، ص ۳۴۳، حاشیہ آیت متعلقہ

۲۶۔ تفسیر احسن البیان، ص ۱۳۹۔ حاشیہ آیت متعلقہ

۲۷۔ تفسیر ضیاء القرآن، ص ۲۲۰، (جلد اول) حاشیہ آیت متعلقہ

مجلس التفسیر کے سربراہ ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج کی علمی و فکری سرگرمیاں

بزم نور مصطفیٰ ﷺ کے زیر اہتمام کے۔ ڈی۔ اے فلیٹ، سرجانی پلازہ، بالمقابل سرجانی پولیس اسٹیشن، کراچی میں منعقدہ جلسہ عید میلاد النبی ﷺ سے ڈاکٹر صاحب نے سورۃ الضحیٰ کی روشنی میں سیرت سرور دو عالم ﷺ پر خصوصی خطاب کیا۔ یہ پروگرام ۲۹ مئی ۲۰۰۵ء بروز ہفتہ بعد نماز عشاء منعقد ہوا۔

محترم نصر اللہ صاحب کی رہائش گاہ واقع گلشن حدید میں "روشن خیالی اور اعتدال پسندی کا قرآنی تصور" کے زیر عنوان، ڈاکٹر صاحب نے خصوصی لیکچر دیا۔ لیکچر کے بعد سامعین کرام کے سوالات کا جواب دیا۔ واضح ہو کہ نصر اللہ صاحب کے زیر انتظام گلشن حدید کے مختلف مقامات پر ڈاکٹر صاحب کے لیکچرز کا سلسلہ گذشتہ دس سال سے جاری ہے۔

پاکستان ٹیلی ویژن کے جشن آزادی کے تعلق سے منعقد کیے گئے ایک ٹاک شو بعنوان "آزادی کا مطلب کیا" میں ڈاکٹر صاحب نے بطور Panelist شرکت کی۔ دیگر شرکاء میں پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن، سید علی مرتضیٰ زیدی، سفینہ جاوید اور هوچی رام شامل تھے۔ یہ پروگرام ۲۵ جولائی ۲۰۰۵ء بروز پیر ریکارڈ ہوا۔

(رپورٹ: شاہین افروز)

چہارگانہ شعری ادبیت سے قرآن مجید پاک ہے

محمد اعظم سعیدی

قومی ادبی ایوارڈ یافتہ ادیب

مہتمم جامعہ اسلامیہ کورے وال، کراچی

قرآن مجید کی اصل غرض و غایت یہ ہے کہ اس مادی دنیا کے فریفتہ، مادی مظاہر میں مستغرق، مادی وسائل میں پناہ گزیں، مادی ہواؤ ہوس میں غوطہ زن اور مادی طاقتوں سے ضروریات زندگی پوری کرنے والے انسان کو اس مافوق المادہ یا مافوق الفطرت حقیقت عظمیٰ سے غافل اور لاتعلق نہ ہونے دے جو ان مادی مظاہر و وسائل اور کائنات و مافیہا کا خالق، مالک، حاکم اور قانون ساز ہے۔

قرآن مجید جملہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات کا نچوڑ و خلاصہ، جملہ صحف و کتب سماوی سے کشید کیا ہوا عطر، تمام علوم و حکمت کے گنجینہ ہائے سربستہ کے ثمرات کا حسین مرقع ہے، علوم اولین و آخرین سے نہ صرف مرصع بلکہ ان کا مؤید و مبدا ہے۔ اگر علوم عقلیہ، علوم اخباریہ (از منہ گذشتہ کی تاریخ و قصص) اساطیر الاولین، اور علمی حقائق اور فلسفی دقائق پر مبنی کتاب، ادق اور ثقیل کلام پر مشتمل ہوتو دور جہالت و جاہلیت میں ایسی کتاب کا نزول لایعنی ولا حاصل ہوتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید کو فصاحت و بلاغت کا مخزن فرمایا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہر وہ کتاب کہ جسکے نزول کا منتہائے مقصود علم و یقین کی طرف رہنمائی کرنا ہو اور جو صدق دل اور خلوص نیت سے ترتیب و تدوین کے مراحل سے گذاری گئی ہو، جو سراپا راستی اور مبنی بر حقیقت ہو، جس میں واقع الامر کی تائید اور صراط مستقیم کی تو کید ہو، جس کا منتہائے نظر انسان کو اس کا سچا اور صحیح راستہ دکھانا ہو، اور حتی الوسع وحتی المقدور انفرادی و اجتماعی ہلاکت سے بچانا ہو تو ایسی ہر کتاب از خود اپنے زور بیان سے اپنی صداقت کو منوالیتی ہے اور تعمق افکار کے باعث بلیغ بلکہ بسا اوقات فصیح بھی بن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاتی ہے۔ لیکن اس فصاحت و بلاغت کا شاعرانہ تکلف اور آمد و آورد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہی مذکورہ معنوں میں قرآن مجید بھی فصیح و بلیغ ہے مگر شعراء جیسی ادبی تعلیوں اور دروغ بافیوں سے مبرا و منزہ ہے۔

علم معانی کی رو سے فصاحت و بلاغت اور ادب باہم متضاد ہیں، قریب الفہم یا مدرک العقل امور و علوم، فصاحت و بلاغت کے زمرے میں آتے ہیں کہ جن کا ایک ایک حرف، ایک ایک جملہ اتنا سہل اور قریب الفہم ہوتا ہے کہ عقل انسانی متلاطم سمندر میں غوطہ زنی کیے بغیر فقط ساحل سے ہی مقصود حاصل کر سکتی ہے۔ جب کہ ادبی ترہات اس کے قطعاً برعکس ہوتے ہیں، کیوں کہ ایک تو وہ ثقیل کنایات اور ادق کلام پر مبنی ہوتے ہیں، دوم اس میں بجز تعلّی کچھ نہیں ہوتا۔ اس لیے ایسی ادبی باریکیوں کو سمجھنا اور مقصود تک رسائی بغیر غوطہ زنی اور ذہنی و عقلی محنت شاقہ کے حاصل نہیں ہوتی۔

الغرض شعری ادبی ترہات اور علم فصاحت و بلاغت میں وسیع تفاوت ہے اور قرآن مجید کی صلائے عام کہ اس قرآن جیسی کوئی ایک سورت ہی لے آؤ یا اس قبیل کی دس آیات ہی گھڑ لاؤ یا صرف ایک ہی آیت لا کر دکھا دو یا اگر وہ دعویٰ میں سچے ہیں تو قرآن مجید کے کسی ایک قول جیسی ہی بات لے آئیں۔ پھر فرمایا کہ اکناف عالم کے جن و انس مجتمع ہو کر بھی اس قرآن کی مثل نہیں لا سکتے۔ اس چیلنج اور صلائے عام میں قرآن کا مثیل شعر و ادب یا رجز و سجع میں طلب نہیں کیا گیا۔ بلکہ علم و حکمت اور تفصیل و ہدایت میں طلب کیا گیا ہے۔۔۔ قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت، عالم آراء حکمت و موعظت، ناپید اخبار و امثلہ، حیرت انگیز صداقت اور بے نظیر ہدایت پر مبنی ہے نا کہ شعراء کی خود ساختہ لاف گزاف ترہات سے متعلق ہے کیونکہ بیشتر مقامات پر قرآن مجید نے اپنے شعر ہونے اور صاحب قرآن کے شاعر ہونے سے صاف انکار فرمایا ہے (ام یقولون شاعر نتربص بہ ریب المنون) یعنی کیا وہ لوگ رسول خدا احمد مجتبیٰ ﷺ کی نسبت کہتے ہیں کہ وہ تو محض ایک شاعر ہیں جس نے اپنے پرکشش تخیل، حسین تصور اور زور کلام سے چند افراد کو اپنا ہم نوا بنا لیا ہے۔ ان کی شان و شوکت اور واہ واہ تب تک ہے جب تک وہ بقید حیات ہیں، اور ہم تو اس وقت کے منتظر ہیں جب موت ان کے پاس آئے اور ان کی تعلیاں پیوند خاک ہو جائیں۔ مگر اللہ عزوجل نے رسول کریم ﷺ کے شاعر ہونے کی تردید فرما دی کہ (وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ) اور ہم نے رسول اللہ ﷺ کو کچھ بھی شاعری کی تعلیم نہیں دی اور نہ ہی شاعری آپ کی شان رفیعہ کے لائق ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب کی حیثیت کو شعر سے بے انتہاء بلند جتلانے کے لئے شعراء کو بدراہ، بے سروپا تخیل و تصور، اور وہم و گمان کی وادیوں میں سرگرداں، جھوٹے اور مفتری قرار دیا ہے۔ (والشعراء یتبعھم الغاون ... وما ھو بقول شاعر) یعنی یہ

قرآن کریم نہ تو کسی شاعر کا کلام ہے اور نہ ہی کسی کاہن کا ڈھکوسلا ہے اور شعراء تو غیّ کے پیروکار ہیں جبکہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے (تنزیل من رب العلمین) اور محمد ﷺ پر نازل کیا گیا ہے (نزل علیٰ محمد)

شعراء اور ادباء عرب نے قرآن مجید کو شعر کہا تھا، حالانکہ قرآن مجید موجودہ معانی میں شعر ہو ہی نہیں سکتا اس لیے کہ موزوں نہیں ہے، بلکہ تمام کا تمام مقفع و مسجع بھی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب ہر اس کلام کو کہ جس میں لطافت بیان ہو۔ ایجاز و اختصار ہو، جس کی عبارت مقفع و مسجع ہو مگر بلا لحاظ وزن، قلیل الالفاظ اور ثقیل الالفاظ ہوا سے شعر کہا کرتے تھے۔ اور ان کے نزدیک فصاحت کا معیار یہ تھا کہ خوبی مضمون کے ساتھ خوبصورت الفاظ کی پیوندکاری خوش اسلوبی سے کی گئی ہو۔ اس میں ترنم اور لے ہو، مطالب دلچسپ ہوں، غیر ضروری عمق ہو، لیکن وزن کا ہونا نہ ہونا ضروری نہ تھا۔ اسی بناء پر اہل عرب سجع، رجز، خطبات، مناظرات، مناقشات، قصائد، اور مراثی وغیرہ کو شعر میں داخل سمجھتے تھے۔ چونکہ اس خطہ کے شعر کا جزو اعظم یہ تھا کہ انسان کے سفلی اور سطحی جذبات یا صرف سماعی محسوسات کو برانگیختہ کیا جائے۔ ان کے اشعار میں باطنی تربیت اور ظاہری تزکیت مقصود نہ تھی۔ اس لیے قرآن مجید کو اپنے متعلق ایسی فصاحت شعری کا معترف ہونا گوارہ نہ تھا۔ اسی نقطہ نظر سے قرآن حکیم نے جا بجا ایسے شعراء اور ایسے فصیح بننے سے انکار کیا ہے۔

اس قرآن جیسی ایک سورۃ تو کہیں سے لے آؤ (فاتوا بسورۃ من مثلہ) کی صلائے عام جو اللہ رب العلمین نے مختلف انواع میں دی ہے، تو کیا یہ صلائے عام قرآن کریم کی ادبیت، اس کی شعریت و شاعریت، اس کے صنائع اور بدائع کی خوبیوں سے متعلق ہے؟ نہیں قطعاً نہیں، اس کتاب جلیل کی عالم آراء حکمت، اس کے ناپید امثال علم، حیرت انگیز موعظت اور بے نظیر ہدایت سے مذکورہ دعویٰ کو چنداں واسطہ نہیں، ورنہ ابو القاسم حریری کی مقامات کا ایک ایک حرف، امراء القیس اور ابن حجر کے قصائد کا ایک ایک بیت و مصرعہ، ان انسانی کمزوریوں اور تکلفات، ان خود ساختہ ترہات اور لغویات سے اس قدر مملو ہیں کہ قرآن مجید کی سہل الفہم اور مدرک عقل عبارت کو ان کے ادبی معیار کے مقابل قطعی نہیں لایا جا سکتا۔ اسی طرح مسیلمہ کذاب کا تراشیدہ قرآن بھی کہ جس کی چند پریشان اور منتشر و متفرق آیات کہیں کہیں مل جاتی ہیں وہ بھی عہد جاہلیت کے ادبی اسلوب شعر میں کہیں کم نہیں ہیں۔ آخر اسی کذاب مدعی نبوت اور مفتری علی اللہ کی سحر کلامی نے ہی قبائل عرب کی ایک کثیر تعداد کو دام تزویر میں دم بخود کر رکھا تھا۔

قرآن مجید آج اکناف عالم میں پھیل کر ساکنان عالم کے لئے حرز جان و ورد زبان اور مشعل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رشد و عرفان بن گیا ہے جب کہ سبعہ معلقہ وغیرہ جیسے ترہات کے تخلیق کاروں کا قافلہ پیوند خاک ہو چکا ہے۔ تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ قرآن مجید کی زبان، علم و ادب کے ان رسمی قواعد کی رو سے بہتر ہے جن کو خود انسان نے ہی وضع کیا ہے اور نہ اس لیے کہ مالک کلام (اللہ تعالیٰ) نے اس کمزور و ناقص انسان کے تخلیق کردہ مزعومہ بہترین اسالیب کا نعوذ باللہ تتبع کیا ہے۔ بلکہ یہ اس لیے ہے کہ کلام الٰہی میں مضامین کی حقانیت و صداقت پر کوئی انگشت نمائی نہیں کرسکتا۔ نیز یہ تصنیف جلیل کلام ملوک میں ملک الکلام ہے جس کی حکمت و حقیقت، جس میں موجود علم و فضل اور نور ہدایت جملہ انسانی تالیفات و تصانیف سے یقیناً بالاتر ہے، یہی ناپیدا کنار علم کا مخزن وضع ہوتا ہی وہ مات کن فضیلت ہے جس کے آگے مغرور سے مغرور گردنیں جھک گئی تھیں۔ اور در کعبہ پر آویزاں قصائد کے مصنفین و تخلیق کاروں کے سرنگوں گئے تھے ادبائے عرب و عجم دم بخود رہ گئے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے سخت گیر و آہن مزاج انسان بھی موم ہو گئے تھے۔ حضرت ابوسفیان نے بالآخر توبہ کر لی تھی۔ اور آج بھی قرآن مجید سے بغاوت کرنے والے اگر گردن اطاعت خم کرتے ہیں تو قرآن کی ادیبانہ و شاعرانہ چست بندیوں کو دیکھ کر نہیں بلکہ لامحالہ اس کے علمی حقائق سے قائل ہو کر اور اس کے دائمی قوانین کو مان کر کرتے ہیں۔

ادبائے عرب کا علم و ادب کیا تھا؟ خیال آرائی، تخیل و توہم، تفاؤل و تشاؤم، ذاتی تراشیدہ روایات اور آبائی مزخرفات کا ایک عظیم الشان طومار تھا، جو ان کا اخلاقی ضابطہ بن گیا تھا۔ شعر گوئی کا یہ ولولہ تھا کہ حالت خواب میں بھی رجز و سجع بلا تامل کہہ دیتے تھے۔ ظہور اسلام سے پیشتر بیسیوں برس تک ہزل گوئی کے یہ پرستار، ادب کے جنونی، امراء القیس، زہیر، لبید بن ربیعہ کے معلقات سبع کے سامنے ماتھا رگڑتے رہے اور مجمہرات اور **منتقیات السبع** کے مصنفوں کو اپنے فکر و تخیل اور ادب کا سچا رہنما مانتے رہے، مگر قرآن مجید کی ایک چھوٹی سی سورۃ (سورۃ الکوثر) نے ان تمام مجموعہ ہائے ترہات کو پیوند زمین کر دیا۔ تخیلاتی اور توہماتی ادب پرستی جڑ سے اکھڑ گئی۔ غرض کہ ترہاتی و لاف گزاف ادب سے متعلق جملہ مافوق الفطرت عقائد و نظریات اور دعاوی ایک مختصری سورۃ کے مقابلے میں باطل ہو گئے۔ قرآن مجید کی روشن و نمایاں حقیقت کے سامنے کذب و دروغ سب فنا ہو گئے۔

متاخرین نقادان عرب نے علم ادب میں ہر طبقہ کے شعراء کے اعلیٰ پائے کے سات قصیدوں کو معلقات کے انداز پر منتخب کر کے سات حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر حصہ میں سات قصائد ہیں یعنی مجموعی انچاس (۴۹) قصائد ہیں اور ان انچاس قصائد کا نام سبع اسابع رکھا ہے جن کے نام مع تفصیل درج ذیل ہیں۔

۱۔ **سبع معلقات**: ان قصائد میں سے سبع معلقات کے ساتوں قصائد بڑے مشہور تھے۔ (یہ قصائد کچھ عرصہ پہلے تک دینی مدارس کے نصاب میں شامل تھے جبکہ کچھ مدارس میں اب بھی پڑھائے جاتے ہیں) سبع معلقات کے مصنفین درج ذیل ہیں۔ (۱) امراء القیس (۲) زہیر بن ابی سلمٰی (۳) حارث بن حلزہ (۴) لبید بن ربیعہ (۵) عمرو بن کلثوم (۶) طرفہ بن عبد (۷) عنترہ بن شداد

۲۔ **سبع مجمہرات**: یہ دوسرے درجہ کے قصائد کا مجموعہ تھا، یہ قصائد نسبتاً کم مشہور تھے۔ ان کے مصنفین درج ذیل ہیں۔ (۱) نابغہ ذبیانی (مشہور حرب قیس کا ایک فریق اور قبیلہ ذبیان کا فرد) (۲) عبید بن ابرص (۳) عدی بن زید (۴) بشر بن کازم (۵) امیہ بن ابی الصلت (۶) خداش بن زہیر بن ابی سلمٰی (۷) نمر بن تولب العکلی

۳۔ **سبع منتقیات**: یہ تیسرے درجہ کے قصائد پر مبنی مجموعہ تھا اس کے مصنفین شعراء اکثر زمانہ جاہلیت ہی کے تھے اور ان کے نام درج ذیل ہیں (۱) مسیب بن علس (۲) مرقش بن جریر (۳) مرقش الاصغر (۴) عروہ بن الورد (۵) درید بن صمہ (۶) مہلہل بن ربیعہ (۷) عثمان بن ثویہ

۴۔ **سبع مذہبات**: یہ چوتھے درجہ کے قصائد کا مجموعہ تھا ان قصائد کے مصنفین کے نام یہ ہیں۔ (۱) حسان ابن ثابت (۲) عبداللہ بن رواحہ (۳) مالک بن عجلان (۴) قیس بن حطیم (۵) احیحہ بن خلاج (۶) قیس بن الصلت (۷) عمرو بن امراء القیس

۵۔ **سبع مراثی**: یہ پانچویں درجہ کے قصائد کا انتخاب تھا۔ ان کہن و تخیل یعنی کہانت و توہم کی پیروی کی تعلیم دی گئی تھی۔ ان قصائد کے شعراء کے نام یہ ہیں۔ (۱) ابو ذویب ہذلی (۲) محمد بن کعب (۳) اعشیٰ باہلی (۴) علقمہ مطوس (۵) ابو زبید طائی (۶) مالک بن ذہب نخعی (۷) متمم بن نویرہ

۶۔ **سبع مشوبات**: یہ چھٹے درجے کے شعراء کے قصائد کا منتخب مجموعہ ہے۔ ان قصائد کے مصنفین کے نام درج ذیل ہیں (۱) کعب بن زہیر (۲) نابغہ بن جعدہ (۳) قطامی (۴) حطیہ (۵) تمیم بن مقبل (۶) شماخ (۷) عمرو بن احمر

۷۔ **سبع ملحمات**: یہ ساتویں درجہ کے قصائد کا مجموعہ ہے۔ اسی مجموعہ کو ہزلیہ شاعری کا انتخاب بھی کہا گیا ہے۔ ان قصائد کے مصنفین درج ذیل ہیں۔ (۱) فرزدق (۲) جریر (۳) اخطل (۴) عبید راعی (۵) ذوالرمہ (۶) کمیت بن زید (۷) طرماح

ان مجموعہائے قصائد میں سبع معلقات وہ مجموعہ ہے جس کے ادب کے سامنے قادر الکلام اہل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عرب اپنی گردنیں خم کیے ہوئے تھے اور یہی وہ مجموعہ تھا جو در کعبہ پر آویزاں کر کے دعوت مقابلہ و مبارزہ دی گئی تھی کہ کوئی بھی مدعی ادبیت اس ادب کا مثل پیش کر دکھائے؟ جب حضور اکرم ﷺ نے سبع معلقات کے مقابلے میں قرآن مجید کی مختصری سورۃ در کعبہ پر آویزاں کروائی تو دوسری صبح سبع معلقات کے مصنفین کے چہرے لٹک گئے اور پکار اٹھے ما ھذا کلام البشر کہ کسی بشر کا کلام ہی نہیں ہے۔ یہاں ہمیں پھر اس آیت پر غور کرنا چاہیے۔

ترجمہ: اے محمد آپ اعلانیہ فرمادیں کہ اگر اطراف عالم کے جملہ انس وجن بھی اس بات پر مجتمع ہو جائیں کہ اس قرآن کی مثل دوسرا قرآن بنالیں تو اس کی مثل لانے پر ہرگز قادر نہ ہو سکیں (القرآن)

اس آیت میں قرآن مجید کی ادبیت موہومہ اور عبارت آرائی سے متعلق ایک حرف بھی نہیں کہا گیا۔ کیونکہ اگر مقابلہ ادب میں ہی تھا تو پھر تمام دنیا کے جن وانس کو دعوت مقابلہ دینے کی کیا ضرورت تھی؟ صرف قادر الکلام اہل عرب شعراء و ادباء کو ہی بلایا جاتا، جن کا مقابلے پر آنا کچھ حیثیت و معنی بھی رکھتا، جب دعوت عام ہے تو موازنہ بھی لامحالہ کسی ایسی خوبی کا ہے جس کے متعلق ہر شخص حتی المقدور کچھ نہ کچھ دعوی کر سکتا ہے اور وہ خوبی علم وحکمت اور ہدایت ورشد کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتی۔ نیز اسی آیت میں جملہ (اس قرآن کی مثل) آیا ہے جس سے اظہر من الشمس ہے کہ اسی مثل کا اشارہ قرآن مجید کے نفس موضوع اور مشمولہ حکمت وہدایت ہی کی طرف ہے جس میں منکرین نے اساطیر الاولین کہہ کر تخفیف کرنے کا مذموم ارادہ کیا تھا۔ اگر اس سے ادبی اور لفظی خوبیوں کی طرف اشارہ ہوتا تو اساطیر الاولین کے الفاظ بے موقع اور بے معنی ہوتے، کیونکہ اساطیر کے لفظ سے غیر فصاحت کے معنی قطعاً نہیں نکلتے اور نہ ہی اولین سے مراد قدیم ادباء وشعراء کی جماعت ہے۔

اسی معنوں میں "مثل" کا لفظ سورۃ طور میں آیا ہے وہاں بھی صاف طور پر قرآن کریم کا مثل شعر وادب میں طلب نہیں کیا گیا۔ بلکہ مقصود قرآن حکیم کے مضامین اور اس کی صداقت کو بلحاظ قدر وقیمت برتر ثابت کرنا ہے نہ کہ شعر وادب میں مثل طلب کرنا ہے، نعوذ باللہ خداوند کریم کوئی شاعر نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو ادبی مقابلے کی صلائے عام دیتا پھرے۔ اگر بعثت رسول ﷺ کے زمانے میں تمام کا تمام عرب ادبیت وشعریت کا خوگر تھا اور اہل عرب کو اپنی شاعری کے مقابل تمام دنیا بے زبان گونگی نظر آتی تھی تو بھی اللہ تعالیٰ پر اس کا کوئی اثر نہ پڑتا اور نہ اللہ تعالیٰ کو ان کے مقابلے پر اپنی ادبیت کو ظاہر کرنے کا شوق ہے۔ اس پاک ذات نے قرآن مجید کو اگر عربی زبان میں اتارا تھا تو صرف اس لیئے کہ عرب کی گمراہ قوم قانون خداوندی کو سمجھ لے اور اس کے منشاء کو اخذ کرے تا کہ اہل عرب کا کوئی عذر لنگ باقی نہ رہے اور ان کی بہانہ

سازیاں معدوم ہو جائیں اور یہ قرآن پاک ان کے لیے باعث پند ونصیحت ہو، مصدر امن وبشارت ہو، اس کے علاوہ عربی زبان میں نزول قرآن کا کوئی اور مقصد نہ تھا (جعلنه قرآنا عربیا لعلکم تعقلون) لوگوں یہ صحیفہ کائنات جو تمہارے سامنے عیاں اور منور ہے اس امر کی گواہی دے رہا ہے کہ ہم نے اس قرآن حکیم کے جملہ پوشیدہ قوانین کا ترجمہ سہل اور عربی زبان میں اس لیے کر دیا ہے کہ تم اس کے سربستہ رازہائے دروں کو سمجھ کر عقلمند ہو جاؤ گویا قرآن حکیم صحیفہ فطرت کے قوانین کا لب لباب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "تو کیا یہ لوگ قرآن مجید کے مقاصد ومطالب پر غور نہیں کرتے" قرآن کریم تو تمام عالم کے لیے بصیرت وتدبیر کی باتوں سے معمور ہے لیکن رحمت وہدایت اسی قوم کے حصے میں آئے گی جو قرآن کی سچائی پر بالاستقلال یقین رکھ کر اس میں تدبر کرے گی۔

وہ لوگ جو دین کے اسرار ورموز اور منشاء وجود سے آگاہ ہیں جس کی رکھی بنیاد قرن اول میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رکھی، جنھوں نے تدبر سے کشید کیا ہوا عرق چکھا اور خود صاحب قرآن کی صحبت میں رہے اور سالہا سال اصحاب صفہ کی مجلس میں بیٹھے، جس کو بلا استثناء سب صحابہ کرام نے ایمان ویقین کی خشت اول قرار دے کر قرآن مجید کی ایک ایک آیت کے مطالب ومفاہیم کی تفسیر میں برسوں تک تدبر کرنا عین ایمان سمجھا تھا، اسی تدبر وتفکر نے ان کے ذہنوں میں یہ بات نقش کر دی کہ قرآن حکیم کی آیات اور ان کے مطالب کس قدر محکم ومستحکم، کس قدر صحیح وفصیح کس قدر مطابق اور کس قدر عمیق وبلیغ ہیں جبکہ اس کے مقابل کوتاہ نظر انسان کا علم کس قدر ہیچ ہے خدائے لم یزل کی طرف سے انسان کو صلائے عام ہے کہ اسے بغور پڑھے، بار بار پڑھے اور دیکھے، مگر اس میں کسی قسم کی کجی، غلطی کی یا کسی غیر مناسب تطبیق کا دریافت کرنا اس کے لیے قطعی محال اور جوئے شیر لانے کے مترادف ہوگا۔

الغرض مذکورۃ الصدر تفاصیل اور حیرت انگیز دعاوی کے بعد مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ اپنی دینی اور دنیاوی زندگی کے اصول وقواعد اور بنیادی ضوابط کی جستجو میں انسانی حکمت کے ہر مسلک خیال اور قیاس ورائے کے ہر نظری مذہب سے قطعاً بے نیاز ہو جاتے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے محیط علم اور محیط فلسفہ کی موجودگی میں کسی ارسطو یا افلاطون کی حکمت کے محتاج نہ ہوتے اپنی انفرادی واجتماعی زندگی کو خوش اسلوبی سے گذارنے کے لئے اسی کتاب کی طرف رجوع کرتے اور اپنے ہر مسئلے اور طریق عمل سے متعلق جملہ بشارات، رہنمائی وہدایات اور علم وخبر اسی کتاب الٰہی سے اخذ کرتے اور قرآن مجید ہی کو اپنے عقائد ونظریات کی حقیقی رسی اور مادی وروحانی مجاہدات کی مضبوط اساس بناتے، معاشرت ومعاشیات، عمرانیات واقتصادیات اور اجتماعی استحکام کا مرکز ثقل اور محور علم یقین کرتے اقوام وملل کی ترقی وانحطاط اور عروج و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زوال کے اسباب ووجوہات، انداز حکمرانی کے اصول، تسلط وتخلف فی الارض کے طریقے، علوم وفنون کے مصادر اور قوانین فطرت اسی قرآن سے لیتے اور ان پر عمل کرتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو ہی تمام عالم کے لئے ضابطۂ عمل اور مکمل آئین مذہب قرار دے کر فرمایا ہے کہ " آج میں نے تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند فرما کر تمہیں دین ودنیا کی نعمتیں بخش دی ہیں"۔

بہر حال اس پر کافی شواہد وبراہین موجود ہیں کہ قرآن مجید، شعری ادب اور شعری فصاحت و بلاغت سے پاک ہے اور اسی پر ہمارا ایمان بھی ہے کہ نہ تو قرآن مجید شعر ہے اور نہ حضور اکرم ﷺ شاعر ہیں اور ارشاد باری تعالیٰ بھی یہی ہے کہ ہم نے اپنے رسول ﷺ کو شعر نہیں سکھایا اور نہ ہی شاعری آپ کی شان کے لائق ہے وما علمنہ الشعر و ما ینبغی لہ اسی طرح قرآن مجید کے بارے میں ارشاد باری ہے کہ یہ کسی شاعری کا قول نہیں ہے وما ھو بقول شاعر اور نہ ہی یہ کسی کاہن کا قول ہے ولا بقول کاھن۔

خود اہل عرب کے ادباء وشعراء نے بھی بجز ایک دو دفعہ کے نہ قرآن کو شعر کہا ہے اور نہ صاحب قرآن کو شاعر کہا ہے بلکہ اس کلام کو اپنے فہم وادراک سے ماورئی دیکھ کر حیرت سے کہتے تھے کہ یہ تو صریح جادو ہے ان ھذا الاسحر مبین یا کہتے کہ یہ تو گھڑا ہوا جھوٹ ہے وقالو ما ھذا الا افک مفتری بھی کہتے یہ تو جادو گزیدہ شخص ہے الا رجلا مسحورا بھی کہتے کہ اس قرآن کی مثل تو ہم بھی بنا سکتے ہیں یہ تو پہلوں کے قصے ہیں لو نشاء لقلنا مثل ھذا ان ھذا الا اسا طیر الاولین بھی کہتے یہ تو بنائی ہوئی باتیں ہیں ان ھذا الا اختلاق بھی کہتے یہ اڑتے ہوئے خواب ہیں بلکہ اس کے گھڑے ہوئے ہیں قالو ا اضغاث احلام بل افتراہ بھی کہتے یہ تو سابقہ امتوں کے قصے ہیں جو انہوں نے لکھ رکھے ہیں وقالو ا اساطیر الاولین اکتبھا بھی کہتے یہ تو جھوٹا جادوگر ہے ھذا ساحر کذاب بھی کہتے یہ تو افک و افتراء ہے ھذا الا افک ن افتراہ اور بھی کہتے یہ تو سکھلایا ہوا مجنون (دیوانہ) ہے وقالو معلم مجنون۔

نیز قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے منکرین قرآن ادبائے عرب کے حوالے سے دو مرتبہ فرمایا ہے کہ ان لوگوں نے حضور اکرم ﷺ کو شاعر کہا ہے ایک سورۂ انبیاء کی آیت ۵ میں بل ھو شاعر بلکہ وہ شاعر ہیں اور دوم سورۂ طور کی آیت ۳۰ میں ام یقولون شاعر نتربص بہ ریب المنون یا وہ کہتے ہیں یہ شاعر ہیں اس پر گردش زمانہ کے منتظر ہیں یعنی ادبائے عرب نے براہ راست قرآن مجید کو شعر نہیں کہا بلکہ حضور اکرم ﷺ کو شاعر کہہ کر قرآن کو شعر کہا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے

بھی حضور اکرم ﷺ کے شاعر ہونے کی نفی فرمائی ہے اور فرمایا وما علمنہ الشعر و ما ینبغی لہ کہ ہم نے اپنے رسول کو نہ شاعری کی تعلیم دی ہے اور نہ ہی شاعری آپ کی شان کے لائق ہے یہ اسی شاعری کی نفی ہے جو عرب میں معروف ورائج تھی ورنہ چند اشعار آپ کی ذات سے منسوب ہیں جو بخاری و مسلم میں موجود ہیں اور آپ نے ممدوح شاعری سماعت بھی فرمائی اور اس کی تعریف بھی فرمائی ہے۔ بہر حال قرآن کی حقانیت اور اسکی تاثیر کے وہ معترف تھے مگر ضد اور ہٹ دھرمی کے باعث وہ خود بھی قرآن نہیں سنتے تھے اور دوسروں کو بھی سماعت سے روکتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کی اس حرکت کو یوں بیان فرمایا ہے لا تسمعو بھذا القران والغوافیہ یعنی کان لگا کر یہ قرآن نہ سنو اور (جب وہ پڑھیں تو) شور مچاؤ اسی طرح جب انہیں قرآن سنایا جاتا تو وہ کہتے قلوبنا اکنۃ کہ ہمارے دل غلاف میں ہیں یا پھر کہتے فی اذاننا وقر کہ ہمارے کانوں میں گرانی (بوجھ) ہے الغرض یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ قرآن مجید، شعری ادب، شعری فصاحت و بلاغت سے قطعی پاک ہے۔ نہ قرآن شعر ہے اور نہ صاحب قرآن شاعر ہیں۔

قرآن مجید کے الفاظ وحروف اگر چہ زبان عرب کی نوع سے ہیں اور ان کی نظم ونثر میں مستعمل ہیں مگر لسان قرآن کا اسلوب تمام اسالیب سے جدا ہے اور انواع کلام مثلاً قصائد، خطبات، رجز، پیغام، ضرب الامثال وغیرہ میں سے کسی سے نہیں ملتا۔ بایں ہمہ سب انواع کا جامع ہے۔

ہے یاد مجھے نکتۂ سلمان خوش آہنگ
دنیا نہیں مردان جفاکش کے لیے تنگ
چیتے کا جگر چاہیے، شاہیں کا تجسس
جی سکتے ہیں بے روشنی دانش فرہنگ
کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے، طاؤس فقط رنگ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن کریم کی اعجازی خصوصیات

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ

مترجم: مولانا اکبر علی

سابق استاذ دار العلوم کراچی، کراچی

پہلی خصوصیت: بلاغت

قرآن حکیم بلاغت کے اس اعلیٰ معیار پر پہنچا ہوا ہے جس کی مثال انسانی کلام میں قطعی نہیں ملتی، ان کے کلام کی بلاغت اس معیار تک پہنچنے سے قاصر ہے، بلاغت کا مطلب یہ ہے کہ جس موقع پر کلام کیا جارہا ہے اس کے مناسب معنی کے بیان کے لیے بہترین الفاظ اس طرح منتخب کیے جائیں کہ مدعا کے بیان کرنے میں اور اس پر دلالت کرنے میں نہ کم ہوں نہ زیادہ، لہٰذا جس قدر الفاظ زیادہ شاندار اور معانی شگفتہ ہوں گے اور کلام کی دلالت جس قدر حال کے مطابق ہوگی اتنا ہی وہ کلام زیادہ بلیغ ہوگا، قرآن کریم بلاغت کے اس بلند معیار پر پورا اترتا ہے، اس کے چند دلائل ہیں۔

بلاغت کی پہلی دلیل

اہل عرب کی فصاحت بالعموم محسوسات کے بیان تک محدود ہے، جیسے اونٹ، گھوڑے یا عورت اور بادشاہ کی تعریف، شمشیرزنی، نیزہ بازی، جنگ یا لوٹ مار کا بیان، یہی حال عجمیوں کا ہے خواہ وہ شاعر ہوں یا انشاء پرداز، عموماً ان کی فصاحت انہی چیزوں کے بیان میں دائر ہے، بلکہ ان اشیاء کے بیان میں ان کی فصاحت و بلاغت کا دائرہ بڑا وسیع ہے، ایک تو اس لئے کہ یہ چیزیں اکثر انسانوں کی طبیعت کے مطابق ہیں، دوسرے ہر ملک اور ہر زمانہ کے شاعروں اور ادیبوں نے ان اشیاء کا ذکر کرتے ہوئے کوئی نہ کوئی جدید مضمون یا لطیف نکتہ بیان کیا ہے، چنانچہ بعد کے آنے والے لوگوں کے لئے پہلوں کی موشگافیاں پہلے سے موجود ہوتی ہیں۔

اب اگر کوئی شخص سلیم الذہن ہو اور ان چیزوں کے بیان کا ملکہ حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہو تو مسلسل مشق کرنے کا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے۔ چونکہ قرآن کریم میں خاص طور پر اشیاء کا بیان نہیں کیا گیا لہٰذا اس میں ایسے فصیح الفاظ کا وجود نہ ہونا چاہیئے جن کی فصاحت اہل عرب کے نزدیک مسلم اور متفق علیہ ہے۔

دوسری دلیل

قرآن کریم میں اللہ نے سچائی اور راست گوئی کا پورا اہتمام کیا ہے اور سارے قرآن میں کوئی ایک بات غلط یا جھوٹ نہیں ہے۔ ادھر جو شاعر اپنے کلام میں سچ بولنے کی پابندی کرے اور جھوٹ کی آمیزش سے احتراز کرے اس کا شعر یقیناً فصاحت سے گر جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کہاوت مشہور ہوگئی کہ "بہترین شعر وہ ہے جس میں زیادہ سے زیادہ جھوٹ بولا گیا ہو"۔ تم دیکھتے ہو کہ لبید بن ربیعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں بزرگ جب مسلمان ہوگئے تو ان کا کلام معیار سے گر گیا ان کے اسلامی دور کے اشعار جاہلی زمانہ کے اشعار کی طرح زوردار نہیں ہیں، لیکن قرآن کریم باوجود جھوٹ سے پرہیز کرنے کے نہایت فصیح ہے۔

تیسری دلیل

کسی قصیدہ کے تمام اشعار شروع سے آخر تک فصیح نہیں ہوتے۔ بلکہ تمام قصیدہ میں ایک ہی دو شعر معیاری ہوتے ہیں اور باقی اشعار پھیکے اور بے مزہ، قرآن کریم اس کے برعکس باوجود اتنی بڑی ضخیم کتاب ہونے کے سارے کا سارا اس درجہ فصیح ہے کہ تمام مخلوق اس کے معارضہ اور مقابلہ سے عاجز ہے، جس کسی نے سورۂ یوسف (علیہ السلام) کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہوگا وہ جانتا ہے کہ اتنا طویل قصہ بیان کے لحاظ سے جان بلاغت ہے۔

چوتھی دلیل

اگر کوئی شاعر یا ادیب کسی مضمون یا قصہ کو ایک سے زیادہ بار بیان کرتا ہے تو اس کا دوسرا کلام پہلے کلام جیسا ہرگز نہیں ہوتا اس کے برخلاف قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کے واقعات، پیدائش و آخرت کے احوال، احکام اور صفات خداوندی بکثرت اور بار ہا بیان کیے گئے ہیں۔ انداز بیان بھی اختصار اور تطویل کے اعتبار سے مختلف ہے عنوان و بیان میں ایک ہی اسلوب اختیار نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود ہر تعبیر اور ہر عبارت انتہائی فصاحت کی حامل ہے اس لحاظ سے دونوں عبارتوں میں کچھ بھی تفاوت محسوس نہیں ہوتا ہے۔

© rasailojaraid.com